نسیمِ لیہ کے سوانحی نقوش: ایک تحقیقی مطالعہ

بشریٰ قریشی☆

Abstract

Naseem-e-Layyah belonged to a far off city of Punjab Layyah. Naseem boasts of a plenty of poetical and literary dimensions. Along with Ghazal, Nazm, Masnavi and Marsia, genres such as literary Essay-Writing, Column-Writing, Translations, Dohra and Kafi seem to have become his identity. The present study deals with the critical as well as research and context-oriented aspects of Naseem's life and work.

نسیم لیہ کا شمار پاکستان کے مشہور اور قادر الکلام شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ آپ کے دادا مولوی محمد صدیق اور والد مولانا غلام نبی اپنے عہد کے مشہور عالم دین تھے۔

پروفیسر مہر اختر کے بقول نسیم لیہ کا خاندان ان کے خاندان کے ساتھ یہاں آ کر آباد ہوا تھا۔ ان کے بزرگ نسیم لیہ کے دادا کے بھائی مولوی نور محمد کو لدھانہ تھل سے لائے تھے اور یہاں مسجد قدیمیاں میں بٹھایا تھا۔(۱) چنانچہ نسیم لیہ نے ایک دینی اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے دادا مولوی صدیق اور والد مولوی غلام نبی مشہور عالم دین تھے۔ ان کے والد بزرگوار حکمت کا علم بھی جانتے تھے، صاحبِ کرامت بزرگ اور مفتیٔ وقت تھے۔ چنانچہ اسلام سے رغبت نسیم لیہ کی تربیت کا حصہ تھی۔ برکت اعوان اپنے مضمون یادوں کے گلاب میں لکھتے ہیں:

''میرے ابا جی بتایا کرتے تھے کہ مولانا غلام نبی جیسا خوش الحان اور شعلہ بیان مقرر

☆شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، ماڈل ٹاؤن، ڈی جی خان

تھل کے پورے علاقے میں کوئی نہ تھا۔خدا نے انھیں لحن داؤدی بخشا ہوا تھا اور وہ
جب قرآن قرأت سے پڑھتے تھے تو جہاں جہاں تک آواز جاتی تھی، پورا ماحول
رک سا جاتا تھا اور یہی صفات حضرت نسیم ایہ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔''(۲)

مولانا غلام نبی کے چچا مولانا نور محمد ایک عالم فاضل بزرگ تھے جن کی خدا رسیدگی کا چرچا دور دور تک تھا۔تمام مسلمان اور ہندو ان کا یکساں احترام کرتے تھے۔مولانا نور محمد صاحب کے بیٹے جناب محمود الرحمان نظامی جامع مسجد ایہ کے خطیب اور امام تھے۔ یہ نسیم ایہ کے گہرے اور بے تکلف دوست بھی تھے۔مولانا محمود، شعر بھی کہتے تھے اور قیس نظامی تخلص کرتے تھے۔(۳)

مولوی غلام نبی مولانا نور محمد کے جانشین تھے۔بعد میں وہ قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے ہاں سات بچوں نے جنم لیا۔سب سے بڑی بیٹی مائی غلام زہرا کی شادی مولوی عبدالحق سے ہوئی، مائی غلام سکینہ کی شادی قاضی عبدالکریم سے ہوئی جو کروڑ میں مقیم ہیں۔سب سے بڑے بیٹے قاضی محمد شفیع تھل ہسپتال ایہ میں بطور ڈسپنسر کام کرتے تھے۔شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے، نرگس تخلص کرتے تھے۔مگر افسوس کہ ان کا کلام حالات کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔دوسرے لڑکے عبداللہ کا کم سنی میں انتقال ہوگیا تھا، تیسرے بیٹے قاضی احمد رفیق محکمہ فون میں ملازمت کرتے تھے۔معروف شاعر، ادیب اور صحافی سلیم اختر ندیم انہی کے فرزند ہیں۔مولوی غلام نبی کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی عبدالسمیع تھے جو نسیم ایہ کے نام سے مشہور ہوئے اور اس ریگ زار جسے ایہ کہتے ہیں' کی علمی و ادبی حوالے سے پہچان بن گئے، قادرالکلام شاعر تھے۔قدرت نے انھیں یہ ملکہ خوب ودیعت کیا تھا۔

مولوی غلام نبی کی زوجہ ایک دین دار خاتون تھیں، وہ اپنے علاقے کی خواتین کو قرآنِ پاک کی تعلیم دیتی تھیں اور دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتی تھیں۔نسیم ایہ نے انہی کی گود میں پرورش پائی۔دینی گھرانے کی تربیت نے مذہب سے وابستگی اور گہرا لگاؤ پیدا کر دیا۔

قاضی عبدالسمیع بھٹہ ۳۱ اگست ۱۹۲۹ء کو اسی نیک خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ان کی ماں نے ہی ان کا نام تجویز کیا تھا۔وہ گھر بھر کے لاڈلے تھے، سب کی توجہ کا مرکز بھائیوں کی آنکھ کا تارا، بہنوں کا راج دلارا تھے چوں کہ وہ سب سے چھوٹے تھے، اتنے لاڈ پیار کے ساتھ ساتھ ان کی

والدہ نے نسیم ایہ کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دینی اور ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور والدہ سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا، کوئی بھی معصوم ذہن جب اپنی پختگی کے مراحل طے کر رہا ہوتا ہے تو آس پاس کا ماحول اس بے رنگ تصویر میں رنگ بھرتا چلا جاتا ہے اور اس کی شخصیت کے مکان کی تعمیر کی اینٹ پر اینٹ رکھتا چلا جاتا ہے۔ سوان کی شخصیت کی تعمیر دینی خطوط پر ہونے لگی۔ والد عربی، فارسی اور سرائیکی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ تینوں زبانوں کا علم بھی انھیں ورثے میں ملا۔ رانا اعجاز احمد کہتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے عالم بھی تھے اور عربی، فارسی، اردو اور سرائیکی پر عبور رکھتے تھے۔ وہ بہت نفیس اردو بولتے تھے۔ (۴)

ادب سے محبت اور لگاؤ انھیں اپنے بھائی کی وجہ سے ہوا۔ وہ محمد شفیع نرگس کے لاڈلے تھے، انہی کی صحبت میں رہ کر انھوں نے ادب سے آشنائی حاصل کی۔ مولوی غلام نبی فن خطاطی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ یہ علم انھوں نے عبدالسمیع کو بھی منتقل کیا، انھیں حکمت کی بھی شدبد تھی۔ وہ ابھی لڑکپن میں تھے جب ان کے بھائی محمد شفیع انتقال کر گئے۔ یہ جانکاہ صدمہ مولوی غلام نبی کے لیے روگ بن گیا۔ بیٹے کی موت نے انھیں بلا کر رکھ دیا۔ لحن داؤدی رکھنے والے غلام نبی کی آواز میں پہلے جیسا لوچ اور بحیثیت واعظ وہ گھن گرج باقی نہ رہی۔ یہ صدمہ آہستہ آہستہ دل کا ناسور بن گیا، وہ بیمار رہنے لگے اور یہی بیماری ان کی موت کا سبب بنی۔ ابھی نسیم ایہ کمسن تھے جب ان کی ساری ذمہ داری ان کے بھائی قاضی احمد رفیع اور والدہ پر آ گئی۔ والدہ ایک سمجھدار خاتون تھیں، دینی تعلیم گھر دینے کے ساتھ ساتھ انھیں مختلف مدارس میں بھی بھیجتی رہیں۔ اسی دوران وہ میانوالی کے ایک مدرسے میں بھی تین سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے جہاں مولانا کوثر نیازی بھی ان کے ہم درس رہے۔ مولانا کوثر نیازی کے وزیر بننے پر وہ یہ بات بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتایا کرتے تھے۔ (۵)

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انھوں نے گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول ایہ میں داخلہ لیا جہاں کوپی چندنا رنگ، ریاض انور اور مشکور خان جیسی شخصیات ان کی ہم جماعت تھیں۔ یہ تقسیم پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ نسیم ان دنوں چھٹی جماعت میں تھے۔ وہ نامساعد حالات کے باعث اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے، انھوں نے نہم جماعت میں تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ خود کو ''مڈل پاس'' کہا کرتے تھے۔

''صحرائے تھل میں شاعری کے ولی دکنی حضرت نسیم ایہ نے عربی، فارسی کی تعلیم کے بعد ایک سکول میں حسب ضابطہ داخلہ لے کر مڈل کی سند بھی حاصل کر لی تھی اور وہ اکثر دوستوں کی محفل میں خود کو ''مڈ لچی'' کہا کرتے تھے۔ دنیا بھر کے علوم کا مطالعہ رکھنے والے علامہ نسیم ایہ نے اپنے روزگار کے لیے پٹوار میں داخلہ بھی لیا تھا۔''(۶)

حصول روزگار کے لیے انھوں نے کئی محکموں میں قسمت آزمائی کی۔ ایک سال تک بطور پٹواری کام کیا، ڈیڑھ سال تک کروڑ لعل عیسن میں تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے، کچھ عرصہ بھکر TDA میں بطور کلرک کام کیا۔ بالآخر ۱۹۶۵ء میں انھوں نے بلدیہ کی لائبریری میں بطور لائبریرین کام شروع کر دیا اور باقی عمر وہیں گزار دی۔ یہ ملازمت بھی معاشی طور پر انھیں مستحکم نہ کر سکی۔ اتنی صلاحیتیں اور خوبیاں رکھنے والا شخص ساری عمر بہتر ذریعہ معاش کے لیے بھٹکتا ہی رہا۔ اسی لیے وہ خود کہتے ہیں:

کب سے افلاس کے تلاطم میں　　لاش کی طرح بہہ رہا ہوں میں
باوجود اس کے میری ہمت دیکھ　　تجھ کو رزاق کہہ رہا ہوں میں(۷)

ستم ظریفی ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کو پنشن بھی نہ ملی۔ کیوں کہ دوست نوازی انھیں بہت مہنگی پڑی۔ ان کے جو دوست لائبریری میں آتے تھے اور واپسی پر کتاب لے جاتے تھے وہ کبھی واپس نہیں کرتے تھے اور کتاب کی واپسی نسیم ایہ جیسے بامروت شخص کے لیے خواب بن کر رہ جاتی۔ ریٹائرمنٹ کے وقت چارج مکمل نہ دینے کی وجہ سے ان کو مکمل گریجویٹی بھی نہ مل سکی۔ یعنی ساری عمر کی ملازمت کا حاصل دوست احباب کی نذر ہو گیا۔ لیاقت علی نیازی کے علاوہ کوئی دوست بھی خبر گیری کو نہ آیا اور انھوں نے ہی ان کے اہلِ خانہ کی مالی معاونت کی۔ بعد ازاں نسیم ایہ کی بیوی نے اپنی سب سے بڑی بیٹی ثمرینہ جمال کی شادی ان سے کر دی جس نے اس بے آسرا خاندان کو نہ صرف تحفظ فراہم کیا بلکہ ان کی تعلیم اور ضروریات کا بھی مکمل خیال رکھا۔ اس ذمہ داری کا بوجھ شاید لیاقت علی خان نیازی کو نہ اٹھانا پڑتا۔ اگر نسیم ایہ کی کوئی نرینہ اولاد گھر والوں کے لیے روزگار کا سبب ہوتی۔ ان کے دوستوں کے خیال میں انھوں نے ایک مشکل زندگی بسر کی اور شاید یہی وجہ ہے کہ مناسب روزگار دستیاب نہ ہونے کے باعث انھوں نے بہت دیر سے شادی کی۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس تھی۔ ۱۵ جون ۱۹۶۹ء

میں ان کی شادی اپنے چچازاد بھائی کی بیٹی زیتون سے ہوئی، وہ اپنے بیوی بچوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔(۸)، ان کے بھتیجے سلیم اختر ندیم کے مطابق:

''وہ ان سے بیس برس چھوٹی تھی اور وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔''(۹)

شادی کے بعد وہ دوستوں کی محفل میں اکثر کہا کرتے تھے کہ آج سے نسیم ختم اور زیتون آ گئی۔ اپنی بیوی سے محبت کے اظہار کے لیے انھوں نے ایک نظم بھی لکھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اے مری زیتون، اے آئینہ دارِ برقِ طور　　سیم رخ، اے سیم وش، اے سیم کوں، اے سیم تن
عطر سامان، گل نما، بلبل نوا، غنچہ دہن　　شمعِ خانہ، رونقِ بزمِ غزل، صبحِ چمن
اے مری زیتون، اے آئینہ دارِ برقِ طور　　اے چراغِ خلوتِ مریم بیاضِ رنگ ونور(۱۰)

زیتون کے بطن سے ان کے پانچ بچے ہوئے۔ بڑی لڑکی ثمر ینہ جمال ثمر ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء میں پیدا ہوئی۔ ثمر کو اپنے والد کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ادبی ذوق اسے ورثے میں ملا۔ بچپن سے ہی وہ بچوں کے مختلف رسائل میں کہانیاں لکھتی رہی۔ اس نے ایم اے اسلامیات کیا اور اب وہ لیاقت علی نیازی کی بیوی ہیں۔ ان کی دوسری بیٹی فرحینہ کمال ۷ جولائی ۱۹۸۰ء میں پیدا ہوئی، اس نے ایم اے اُردو کیا ہے۔ ان کی تیسری بیٹی آئینہ مثال ہے جو ۱۹۸۳ء میں پیدا ہوئی، وہ پنجاب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں اور اردو ادب کی طالبہ رہی ہیں۔ نسیم ایہ کا بڑا بیٹا مشکور حسین ۱۹۸۴ء میں پیدا ہوا، گریجویشن کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں مصروف ہے۔ فیصل منشور ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے جو ۱۹۸۷ء میں پیدا ہوا اور والد کی وفات کے وقت سن شعور تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے بہت لگاؤ رکھتے تھے، ان کی زوجہ کہتی ہیں:

> ''انھوں نے بیس سال کی بھرپور ازدواجی زندگی بسر کی۔ بچوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے، گھر سے باہر جو چیز کھاتے تھے وہ اپنے بچوں کے لیے ضرور لے جاتے۔ کہتے تھے کہ اگر نہ لے کر آؤں تو ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، لوگوں کا خیال تھا کہ نسیم اپنے بیوی بچوں کے پیچھے پاگل ہیں۔(۱۱)

نسیم ایہ کا سب سے چھوٹا بیٹا فیصل منشور ابھی ڈھائی سال کا تھا جب مشیت ایزدی پر لبیک

کہتے ہوئے وہ انھیں اس بے رحم دنیا کے تھپیڑوں کے حوالے کر کے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان جیسے نابغہ روزگار لوگوں کی موت کبھی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے فن کے ذریعے زندہ رہتے ہیں، ان کی تخلیقات انھیں ہمیشہ ادب کے حوالے سے کیے گئے تذکروں میں ابدی حیات بخشتی ہیں۔

اپنی زندگی میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے نسیم ایہ نے بتایا کہ ان کی تخلیقی زندگی کا آغاز ۱۹۴۴ء سے ہوتا ہے تاہم جعفر بلوچ کے مطابق: ''انھوں نے باقاعدہ شعر گوئی ۱۹۴۷ء سے شروع کی۔''(۱۲)

نسیم ایہ نے جب پٹوار میں داخلہ لیا تو الطاف مشہدی جو شکستہ مشہدی تخلص کرتے تھے' سے ان کی ملاقات ہوئی۔ شکستہ مشہدی اس وقت قانون گو تھے۔ نسیم کے اندر شاعری سے پہچان کے بیج ان کے بھائی محمد شفیع نرگس اپنی شاعری کے ذریعے بو چکے تھے۔ شکستہ مشہدی کی رفاقت میں یہ بیج پنپنے لگ گیا۔ چنانچہ انھوں نے ابتداء میں شفیع عاصی اور شکستہ مشہدی سے اصلاح لینا شروع کر دی۔ لیکن وہ باقاعدہ شاگرد فرمان پٹیالوی کے ہوئے۔ گوپی چند نارنگ، ریاض انور، مشکور خان اور نسیم ایہ کی زمانہ طالب علمی کی سنگت اور اردو کے استاد مرید حسین کی رہنمائی با لآخر قاضی عبدالسمیع کو شاعری کے دشتِ بیکراں تک لے آئی۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ ''نظامِ جدید'' لاہور میں شائع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس آتش نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا اور انھیں شاعر شباب نسیم ایہ بنا دیا۔ بعد میں یہ بادِ نسیم، ایہ کا تعارف بن گئی جس کے متعلق طارق عزیز شو میں سوال کیا گیا کہ ایسا کون سا شاعر ہے جس کا نام صرف لفافے پر لکھ دیں تو خط اسے مل جاتا ہے۔ برکت اعوان اپنی یادداشتوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں

> ''میں ایک دفعہ مری گیا، وہاں مرا بھائی مقیم تھا۔ وہاں بھائی کی گھر پر غیر موجودگی کی صورت میں ایک دُکان سے سودا لینے گیا تو وہاں میری ایک آدمی سے ملاقات ہوئی اور باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ میں نے کہا ایہ سے۔ اس نے پرجوش انداز میں مجھ سے کہا اچھا نسیم ایہ کے شہر سے آپ کا تعلق ہے۔ پھر وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا اور صبح آٹھ بجے سے ۱۲ بجے دن تک محض نسیم ایہ کی وجہ سے میری مہمان داری کی۔(۱۳)

ایہ کے فن کی بلندی کا سبب ان کی شاعری کا نیا رنگ اور نیا آہنگ ہے۔ یہ دلکش اسلوب تحریر قدرت کے ودیعت کردہ شاعری کے ملکہ کے ساتھ ساتھ ان کے وسیع مطالعہ کے سبب تھا۔ اسی لیے وہ سب کچھ چھوڑ کر شاعری ہی کے ہو رہے۔ اس تخلیقی محاذ پر انھیں بہت سی دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ ڈوبتی اخلاقی قدریں ان کی حساس شاعرانہ طبیعت پر کسی بارِ گراں سے کم نہ تھیں۔ اس لیے انھوں نے بہ بانگِ دہل معاشرتی استحصال اور ظلم وجبر کے خلاف بھی لکھا اور زمانے کی ناقدر شناسی کا گلہ بھی کیا۔ دنیا کی سرد مہری کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری میں بڑے کرب سے کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

مرے حسین خداؤ میں، ایک شاعر ہوں — مری ہنسی نہ اُڑاؤ میں، ایک شاعر ہوں
اگر کسی نے فریب وفا دیا تم کو ! ! — تو میرے ساتھ نبھاؤ میں، ایک شاعر ہوں
مری حیات کی رونق تو میکدوں سے ہے — مجھے حرم سے بچاؤ میں، ایک شاعر ہوں (۱۴)

زمانے کی بدلتی ہوئی روش کے ساتھ ساتھ نسیم ایہ کی شاعری کا آہنگ و انداز بھی بدلتا رہا۔ اسی بات نے ان کی شاعری کو زندہ رکھا اور آنے والی کئی صدیوں تک ادب کا قاری ان کے افکار و نگارشات سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔ بدلتے ہوئے حالات کے دھارے نے ان کی سوچ کے دھارے بھی بدلے اور امتدادِ زمانہ نے ان کی فکر اور اسلوبِ بیان پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔

اردو، عربی، فارسی اور سرائیکی زبان پر عبور نے ان کے کلام کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ خوبصورت تشبیہات واستعارات اور تلمیحات نے ان کی شاعری کے گلستان کو مہکا دیا۔ ان کی علم دوستی سے تو کسی کو انکار نہیں۔ اسی علمیت کے سبب انھوں نے ایہ کے نوعمر اذہان کو ادب جیسی تعمیری اور تخلیقی سرگرمیوں میں لگا دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین، پروفیسر مہر اختر وہاب، شعیب جاذب، پروفیسر جعفر بلوچ اور ان جیسی لاتعداد ادب کی قد آور شخصیات نے ان سے کسبِ فیض کیا۔

نسیم ایہ نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ نظم، غزل، قطعہ اور اُردو منظوم تراجم بھی خوب کیے۔ لیکن ان کا اصل میدان غزل تھا جو متنوع موضوعات کا مجموعہ ہے۔ نئی اور منفرد تراکیب کو بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ استعمال کیا۔ ان کی غزلیات حسن وعشق سے لے کر سیاسی سماجی اور معاشی موضوعات سے مزین ہیں۔ معاشی ناآسودگی، وسائل کی کمی، احباب کی بیگانگی اور لاتعداد مسائل

کے باوجود ریگزار تھل کے اس ''تھلوچڑ'' نے اپنے علاقے کی نمائندگی کی۔ اسی لیے ایہ ان کے نام کا حصہ بن گیا اور اس گمنام شہر کا نام اور مقام انھوں نے بلند کر دیا۔

نسیم ایہ خوش گلو تھے، اسی لیے جب مشاعرے میں ترنم کے ساتھ کلام پڑھتے تو لوگ جھوم اٹھتے تھے۔ مشاعرے میں ان کے بعد لوگ کسی اور کو توجہ سے نہ سنتے تھے۔ پروفیسر جعفر بلوچ لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے ۱۹۴۵ء میں اقبال کے رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ عبدالحمید عدمؔ کے تتبع میں لکھتے رہے۔ ''حسینیت'' کے حوالے سے جوشؔ کی تقلید بھی کی۔ دامنِ یوسف میں حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کے آہنگ و انداز کو بھی اپنایا۔ (۱۵)

ان کی شاعری کے پہلے دور کی تصانیف حیات نامہ جناح اور تعمیر خودی ہیں۔ اسی دور میں انھوں نے فرمانؔ پٹیالوی سے بھی اصلاح لی۔ یہ دور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کا ہے۔ اب ان کی یہ دونوں تصانیف دستیاب نہیں۔ شاعری کے دوسرے دور میں انھوں نے عبدالحمید عدمؔ کا رنگِ تغزل اختیار کیا۔ اس دور میں عدمؔ کی زمینوں میں انھوں نے کئی غزلیں کہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''تختِ بلقیس'' اسی دور کی تصنیف ہے جو بعد ازاں ''برگِ لرزاں'' کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء میں دینی تعلیمات خمریاتی احساس کو دبا دیتی ہیں اس دور میں وہ ''دامنِ یوسف'' اور ''صبحِ بقا'' تخلیق کرتے ہیں۔ آخری دور میں ان کی سرائیکی شاعری نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی کتاب ''وکھرے ڈکھ حسین دے'' اسی عہد کی تخلیق ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کی غزلیات کا مجموعہ ''برگِ لرزاں'' شائع ہوا جو ان کی شاعری کے حوالے سے ان کی نمائندہ کتاب ہے۔ اس سے قبل انھوں نے اقبال کی چند غزلیات اور کچھ نظموں کا سرائیکی زبان میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ وہ فی البدیہہ شاعری کے امام کہے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے راقم سے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا:

> ''نسیم صاحب کو شعر کہنے کا ہنر آتا تھا۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی کی عمدہ اور قابلِ داد صورتیں ملتی ہیں۔ اپنے سینئر معاصرین میں انھوں نے کہیں کہیں جوشؔ ملیح آبادی اور عدمؔ سے استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً ان کے قطعات پر عدمؔ کے اسلوب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کے منظوم تراجم بھی ان کی قدرتِ کلام کے شاہد ہیں۔'' (۱۶)

نسیم کے کلام میں ایک خاص ماحول کا بیان بھی ہے۔ ماحول، حالات اور خاندانی پس منظر کے حوالے سے انھوں نے اپنی علمی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ان کا تعارف اس بات کی گواہی ہے کہ انھوں نے اپنے علمی ورثے کی نگہبانی کا فریضہ اپنے ذمہ لیا تھا اور اسے سنبھالنے کی کماحقہ کوشش بھی کی۔ ان کی بیاض کا ایک ورق ملاحظہ کیجیے:

میں/ اپنے جدِّ امجد
قبلہ طریقت/ حضرت گرامی مولانا نور محمد صاحب ولیٔ دوراں کا وہ گمنام پوتا ہوں
جس کو فن کار/ شاعر شباب نسیم ایبہ جس کو علما/ مولوی نسیم
جس کو مصنفین/ مصنفِ دامنِ یوسف جس کو سوسائٹی/ نیم منطقی و نیم فلسفی
جس کو مدرسین اسلام/ بے کراں عناصر و مبحث
جس کو نعت خواں/ خوش گلو، نعت گو
اور جس کو عوام/ ایک اچھا شاعر سمجھتے ہیں
لیکن اتنی پر اسرار آوازوں کے ہوتے ہوئے میری یہ آواز کون سنے گا؟
سب کچھ ہو کر بھی میں کچھ نہیں ہوں/ مجھے
علامہ حضرت مولانا غلام نبی صاحب/ اپنے عالم باپ نے
اس لیے جنا ہے کہ میں ان کی جاگیرِ علم برباد نہ ہونے دوں
اگر اس متاعِ گراں قیمت کو
میں نے کسی مصرفِ بے جا کی بھینٹ چڑھایا تو تمھیں ہر طرح
کا حق حاصل ہے کہ آج/ مجھے میرے سامنے نا خلف کہہ دو......وگرنہ
کل قیامت کے روز/ یادا ورِ محشر! میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ
میں تو بازار کے ہر صراف/ کے پاس اپنا سونا لیے لیے پھرا لیکن کسی نے پرکھنے کی
زحمت/ گوارا نہ کی۔ (۱۷)

شاعری کے علاوہ نسیم ایہ راگ راگنیوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ مولوی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود انھیں موسیقی سے بھی شغف تھا۔ وہ گھر والوں سے چھپ کر باقاعدہ موسیقی سیکھتے رہتے تھے۔ بقول برکت اعوان:

> ''وہ برصغیر کی ایک مشہور مغنیہ جو تقسیم کے بعد ایہ آ کر آباد ہوئی تھی' کے پاس جاتے تھے۔ وہ باقاعدہ ان سے فرمائش کر کے راگ سنا کرتی تھی۔(۱۸)

اسی طرح پروفیسر مہر اختر وہاب بھی بتاتے ہیں:

> ''۱۹۸۲-۸۳ء کی بات ہے کہ میں نسیم ایہ کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ انھوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ کبھی تہذیب اور ثقافت کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے ایک خاتون کا تذکرہ کیا کہ وہ ان سے ہارمونیم سیکھنے جاتے تھے۔ موسیقی کے شوق میں انھوں نے ایک مغنیہ/گائیکہ اور رقاصہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔(۱۹)

ان کی مندرجہ ذیل غزل جو اپریل ۱۹۸۹ء میں روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئی، ان کی راگ اور موسیقی سے نسبت اور لگاؤ کا کھلا اظہار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مرے دیار، مرے شہر، مری گلیوں کو — گوالیار بناؤ، غزل کا موسم ہے
اس ایک شرط پہ چھیڑے ہیں ساز خسرو نے — کہ ''راگ ٹھاٹھ'' کے گاؤ غزل کا موسم ہے
کدارا چھیڑ دیا کس نے چاندنی شب میں — دلوں کے ساز بجاؤ غزل کا موسم ہے
وہ راگ چھیڑو کہ اقبال بانو یاد آئے — غزل قتیل کی گاؤ غزل کا موسم ہے
تماشا دیکھیں گے ہم آنسوؤں کی رم جھم کا — ملہار جھوم کے گاؤ غزل کا موسم ہے
فضا میں گونجی ہے دربارِ اکبری کی صدا — کہ تان سین کو لاؤ غزل کا موسم ہے
غزل کے ساز پہ ''ملتانی'' کر کی لے چھیڑو — وہ ''پیلوں پکیاں نی'' گاؤ غزل کا موسم ہے
وہ شخص نیند سے کلیان کو جگا دے گا — پٹھانے خاں کو بلاؤ غزل کا موسم ہے
نسیم روح کی تاریں بھی جھنجھنا اٹھیں — ذرا ستار بجاؤ غزل کا موسم ہے(۲۰)

کہا جاتا ہے کہ وقت سب سے بڑا منصف ہے۔ یہ فیصلہ دیتا ہے کہ کس نے اپنے فن کے بل بوتے پر زندہ رہنا ہے اور کون بعد از مرگ کتاب کے اوراق میں دفن کر دیا جائے گا۔ نسیم ایہ کے شاعرانہ افکار کو وقت نے اپنے دوش بدوش زندہ رکھا ہے۔ بقول ڈاکٹر خیال امروہوی:

''وہ نہایت سادہ اور گہری فکر کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے۔''(۲۱)

اس گہری فکر کی بنیاد پر وہ بہت جلد استاد الاساتذہ کہلانے لگے۔ ایسا انسان جو حالات اور وقت کے دباؤ کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے مفلسی کے پے در پے وار سہتا رہے لیکن اپنی حسیات کی حفاظت اور اپنی فکر کو بلند اور اپنے سچے جذبوں کی پاسداری کرتا رہے۔ یقیناً وہ بڑے کردار کا آدمی ہے۔ ان کی بیوی کے بقول:

''وہ انسان دوست اور انسانیت سے محبت کرنے والے تھے۔ جہالت سے سخت نفرت کرتے تھے ان کے افکار کے سارے پرتو ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں کیوں کہ شاعری ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ غربت کے باوجود ہر دل عزیز اور سخی تھے۔ مہمان نوازی بھی ان کی شخصیت کا وصف تھی۔''(۲۲)

ان کی شاعری میں ایک مخصوص تہذیبی رچاؤ نظر آتا ہے۔ اگرچہ ان کی مادری زبان سرائیکی تھی لیکن تہذیبی حوالے سے لکھنوی طرزِ بیان اور طرزِ انداز اختیار کیے رکھتے تھے۔ یادوں کے گلاب میں برکت اعوان نسیم ایہ سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں مزدوری کے سلسلے میں راولپنڈی جا رہا تھا۔ میں مسافرت اور غریب الوطنی کے دن کاٹ رہا تھا۔ کہیں کہیں ایک دو دن مزدوری مل جاتی تو دو دن شکم پری کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا ورنہ بے روزگاری کا مسلسل کرب طاری رہتا تھا۔ ایک دن پہلے مزدوری سے بچے ہوئے پیسوں سے میں نے کھانا کھایا اور ٹکٹ بھی لیا تھا۔ لیکن اب دو وقت سے پیٹ خالی تھا۔ نقاہت سے مجھے بار بار اونگھ آ رہی تھی، گاڑی کو کہیں جھٹکا لگنے سے آنکھ کھول کے ڈبے کو دیکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ گرم لو کے تھپیڑے اور ڈبے میں گھس آنے والا گرد و غبار جسم کو جلائے جا رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں ایک درد بھری آواز پڑی جو کچھ اس طرح سے تھی۔

''رانجھن چھیڑ سویلے منجھیاں تے چٹی ہیر کوں نال رلائی جل، منت لائی جل''۔

گانے والا بھیرو کے سروں میں گا رہا تھا کہ ''اے رانجھن اٹھ اور اپنی بھینسوں کو بیلے کی طرف لے چل لیکن اے مرے محبوب میں تیری چاہنے والی 'ہیر' ہوں، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل، تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ درد بھری آواز والے کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں بے ساختہ اٹھ کر گانے والے کے پاس چلا گیا۔ ریل کے ڈبے کی زرد روشنی والے بلب کے نیچے سرخ وسفید رنگت سیاہ داڑھی، لبیں صاف، بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی ڈوری، ہونٹوں پر دندا سے کی تہہ، سر پر سفید رام پوری ٹوپی بغیر بین کے لکھنوی ناپ کا سفید براق کرتہ، چوڑی دار سفید پاجامہ، پاؤں میں سیاہ رنگ کا سلیم شاہی جوتا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ لکھنو کا یہ آدمی سرائیکی زبان اتنی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ گا رہا ہے۔ یہ تھی تھل کے شاعرِ شباب نابغہ عصر حضرت علامہ نسیم ایہ سے میری پہلی ملاقات۔ ریل گاڑی میں جب وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ لکھنو کے رہنے والے ہیں یا صحرائے تھل کے تھلوچی سرائیکی ہیں۔ ان کی تراش خراش اور نستعلیق اردو بولنے کا انداز مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال رہا تھا۔''(۲۳)

دامن یوسف، صحِ بقا، تختِ بلقیس (مجموعہ قطعات)، لالۂ صحرا، وکھرے ڈکھ حسین دے، بالِ جبریل کا منظوم سرائیکی ترجمہ، نکہت گل اور برگِ لرزاں ان کے شعری فن پارے ہیں۔ ان کے علاوہ بیاضوں میں موجود غیر مطبوعہ اور اخبارات میں شائع شدہ مواد الگ ہے۔ ان کے شعری مجموعے اگرچہ سرمایہ نہ ہونے کے باعث ناقص طباعت اور چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں ہیں جس طرح گدڑی میں لعل پوشیدہ نہیں رہ سکتے اسی طرح نسیم ایہ کی شعری اولاد ان کے تخلیق کردہ اشعار میں مخفی افکار کی خوشبو بھی چھپی نہ رہ سکی۔ ان کے شعری مجموعے برگِ لرزاں کی تقریب رونمائی مختلف علاقوں میں ہوئی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۸۶ء کو ایک تقریب لاہور کے مقامی ہوٹل میں منعقد ہوئی جس کا اہتمام جعفر بلوچ نے کیا۔ اس تقریب میں آسمانِ ادب کے درخشاں تاروں نے شرکت کی جس کی صدارت جناب عطاء الحق قاسمی نے فرمائی، جس میں پروفیسر جعفر بلوچ نے ان کی شخصیت کے حوالے سے بات کی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے برگِ لرزاں کو غزل کے ایک منفرد لہجے کا حامل مجموعہ قرار دیا ہے۔ پروفیسر افضل آرش نے نسیم ایہ کے فن اور فکر پر بحث کی۔ شعیب جاذب نسیم کے خاص شاگردوں میں سے تھے، انھوں نے

ان کے حسنِ تغزل، تلمیحات اور تشبیہات سے بحث کی۔ سلیم اختر ندیم اور گلزار محبوب نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جناب عطاء الحق قاسمی نے بحیثیت صدر تقریب برگِ لرزاں کو ایک محبِّ وطن پاکستانی کی شاعری قرار دیا۔ انھوں نے ان کے قادر الکلامی اور ان کی پاکیزگی فکر کی داد دی۔ برگِ لرزاں کا دیباچہ ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے کہا:

> میں نے اس قریے کو جن شاعروں کی خوشبو سے معمور پایا ان میں ایک نسیم ایہ بھی تھے۔ میرے لیے یہ خوشبو کا جھونکا دراصل جرسِ غنچہ کی صدا تھا۔ میں بوئے سحر کے مست بلاوے پر اس سرزمین کی طرف بے اختیار کھنچا چلا گیا جس نے دھرتی اور شاعری کے درمیان ہر قسم کی مغائرت ختم کر دی تھی اور اب نسیم کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی.....۔
> نسیم نے اپنا وہ شعر سنایا جس کی گونج عرصے سے ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔
> آپ اگر تخت نشیں ہیں تو بڑی بات نہیں ڈھول بھی اڑ کے بلندی پہ پہنچ سکتی ہے (۲۴)
> وہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے والے انسان تھے۔ وہاں کے شاعروں سے ہٹ کر ایک الگ دنیا آباد کی۔ یقیناً نسیم ایہ کی تخلیقات زندہ رہنے والی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف شاعری بلکہ نثر کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ تحقیق اور تنقید کے حوالے سے مختلف جرائد و رسائل میں ان کے کئی پرمغز مضامین شائع ہوے جو یقیناً اپنی مثال آپ ہیں۔ لائبریری کی ملازمت انھیں معاشی آسودگی تو نہ دے سکی لیکن علم کی پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈے میٹھے پانی کا کنواں ضرور ثابت ہوئی۔ ان کی ملازمت کے دوران ایہ میں جو ادبی ٹھکانے مشہور تھے، ایک نسیم ایہ کی لائبریری اور دوسرا صابر ہوٹل جو اسٹیشن کے پاس واقع تھا۔ جہاں ادبی ستارے اپنی محافل سخن برپا کرتے اور ایک دوسرے کو داد دیتے اور چند لمحوں کے لیے سب غموں سے آزاد ہو کر ادب کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں آ جاتے۔
>
> نسیم ایہ نے ایک بھرپور تخلیقی زندگی بسر کی، دوستوں کی محفلوں کی جان بھی رہے، بہت جلد استاد شعرا میں شمار ہونے لگے۔ ان کی صحبت بہت سے نوجوانوں کو تھل کے ریگزاروں کی تپتی دھوپ میں بھٹکنے کی بجائے ادب کی نرم اور سبک روشنی میں لے آئی جس سے نہ صرف ان کے کردار کی تعمیر ہوئی بلکہ وہ معاشرے کا بوجھ بننے کی بجائے معاشرے کے مفید رکن بن گئے۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھے

جنھیں چند ایک بشری کمزوریوں کے باوجود ایک اچھا انسان کہا جا سکتا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے انھیں حسین سراپا عطا کیا تھا۔ پر اثر بولتی آنکھیں ایسے کٹورے جن میں گلابی ڈورے تھے، کاجل جنھیں حسین تر کر دیتا تھا، پان کھاتے تھے، سفید کرتہ پاجامہ زیب تن کرتے تھے۔ جناح کیپ سر کی زینت ہوتی تھی۔ آواز ایسی کہ سن لیں تو چلتے کارواں رُک جائیں، صورت دیکھیں تو بس دیکھتے ہی چلے جائیں۔ اگر کسی چیز کی کمی تھی تو بس دولت کی''۔(۲۵)

یہ سراپا ان کی زوجہ زیتون اختر نے راقم سے ملاقات کے دوران بتایا۔ شاعر شباب نسیم ایہ کا ہفت روزہ ''بشارت''، مظفر گڑھ ۸ جون ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں سراپا اور تعارف کچھ یوں شائع ہوا:

''نام عبدالسمیع، تخلص نسیم، وطن ایہ، عمر تیس سال، حسین و جمیل زلف دراز، چہرہ گول، رنگ گندمی، سفید بشرا، متقطع ریش، وضع میں شاعرانہ رکھ رکھاؤ، بات بات میں طنز و حکمت، بلا کے حاضر دماغ و حاضر جواب، ایہ کی بے ادبیوں کے ہر وقت شکوہ سنج، سوسائٹی کے ہیرو، پورے تھل کی ناک، اردو فارسی سرائیکی (ملتانی) پنجابی ہر زبان میں پختہ شعر کہتے ہیں۔ حکیم، علامۂ دوران، حضرت مولانا مولوی غلام نبی، رئیس العلما کے ذہین اور مفکر خلف الرشید، والدہ محترمہ فاضلہ اور عالمہ، خاندان صاحب علم و عرفان، جد امجد حضرت نور الاولیا مولوی نور محمد صاحب الدرجات کے پہلے اور آخری نواسے، ایہ تھل میں بیٹھ کر اٹھارہ برس سے شعر گوئی اور اَن تھک پیغام دے رہے ہیں۔ غیر مطبوعہ تصانیف متعدد اور مطبوعہ تصنیف دامن یوسف منظوم تفسیر سورۃ یوسف مشاعروں کے دھنی، خوددار طبیعت، پاکستان کے مشہور فنکار ایک پیارا شاعر دوسرا مولوی فکر مزاج رندانہ طبیعت قلندرانہ، ایہ میں اچھا شعری حلقہ تلامذہ، علما کرام میں خاصا مقام، تنقید و بحث میں انتہائی شغف!!!''(۲۶)

نسیم ایہ کی شخصیت کے خدوخال کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر خیال امروہوی لکھتے ہیں:

''مومن خان مومن کو اٹھائیے اور نسیم صاحب بٹھائیے۔ سڑک پر چلتے ہوئے محافل میں بیٹھے ہوئے اگر کسی شخص کو آپ معانقے، مصافحے، تبسم بہ لب، ضلع جگت کرتے ہوئے دیکھیں تو سمجھیے ایک متبحر عالم اپنی کوٹھڑی کی تاریکی اور تنگیٔ

ماحول سے گھبرا کر حقیقت شناسوں سے حظ اٹھانے کے لیے باہر نکل آیا ہے۔
ورنہ اگر گھر میں کشادگی صحرا ہو تو نسیم کبھی برآمد نہ ہو.....۔نسیم صاحب کی زبان
دودھاری تلوار، نگاہ ریزہ ہیں،فکر عرش مقام اور دل زخموں سے چور ملے گا۔دنیا کے
ہر موضوع پر گھنٹوں بولنے میں ظہیر کاشمیری کے بعد آپ کا نمبر آتا ہے۔''(۲۷)

بذلہ سنجی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی ، ان کی موجودگی میں محفل کشتِ زعفران بن جاتی تھی ۔

ڈاکٹر مزمل حسین اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں:

''رمضان کے دنوں میں چائے خانہ صرف ریلوے اسٹیشن پر کھلا رہتا تھا، ہم
وہاں جاتے اور گھنٹوں نسیم ایہ کی زعفرانی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ۔نسیم ایہ کی
شخصیت کا یہ وصف انتہائی حسین تھا کہ آپ کی محفل میں ہر مزاج کا بندہ خوش و
خرم رہتا اور بوریت اس کے پاس سے نہ گزرتی ۔وہ ہر آنے والے نئے مہمان کا
مزاج فوری سمجھ جاتے تھے۔اس کے مزاج کے عین مطابق گفتگو کرتے .....نسیم
ایہ کو زبان و بیان پر جو قدرت حاصل تھی اس کا استعمال وہ جگت بازی میں بھی
خوب کرتے تھے۔اس لیے ان کی جگتوں میں ادبیت کا تڑکا ہوتا تھا۔''(۲۸)

بذلہ سنجی اور طبیعت کی شوخی کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں، اسٹیشن کے سامنے صابر ہوٹل کی
چھت پر اہلِ قلم جمع ہوتے تھے۔ایک دن یہ اصحاب جمع تھے کہ محمود الرحمٰن (قیس نظامی)سرائیکی اور
اردو کے شاعر آتے ہوئے نظر آئے۔نسیم ایہ نے کہا کہ ایک مصرع دیتا ہوں،شعر مکمل کر دیں۔سب
نے کہا، ارشاد! انھوں نے پہلا مصرع دیا، اندر داخل ہوتے ہوئے مولوی محمود نے فوراً اس کا جواب
دے کر شعر مکمل کر دیا جس سے محفل کشتِ زعفران بن گئی۔شعر کچھ یوں تھا:

مولوی محمود کو پھاٹک میں دو تھانے میں دو بے خودی میں پھاند جاتا ہے مری دیوار کو

جمال پرستی ان کی طبیعت کا خاصا تھی۔انھیں قدرت نے حسین بنایا تھا اور حسن کو پسند کرتے
تھے۔حسین چہروں کو دیکھ کر ضرور تعریف کیا کرتے تھے، اپنے مضمون یادوں کے گلاب میں برکت
اعوان نے نسیم ایہ کو صحرائے تھل کا ولی دکنی قرار دیا۔انھوں نے غزل کو شاعر کے اعتبار سے کہا ہو یا تھل کی

شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہو۔ بہر حال ولی اور نسیم ایہ میں جمال پرستی کی قدر بھی مشترک ہے۔ نسیم ایہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

آ کے کھل اٹھتے ہیں ہونٹوں پر تبسم کے گلاب　　جب کبھی لیتا ہے انگڑائی ترا کافر شباب
شہر دل کی مدبھری جوگن تجھے مرا سلام　　تیری آنکھوں میں گھلا ہے نشہء عمرِ خیام(۲۹)

جمال دوست نسیم کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ بہت بے تکلف تھے۔ دوستی کرنا اور نبھانا جانتے تھے۔ لیاقت علی نیازی جب ایہ میں بطور A.C تعینات ہوئے تو ان کے نسیم ایہ سے گہرے مراسم اور دوستی ہوگئی۔ جب ان کا ایہ سے تبادلہ ہوا تو دوستوں کے ساتھ محبت رکھنے والا یہ شخص بہت اداس ہوگیا۔ جدائی کے خوف سے تڑپ کر بول اٹھا

ان کو جھلسائے گی اک عمر تیری یاد کی دھوپ　　چند لمحے جو ترے قرب کی چھاؤں میں رہے

انھیں دوستوں کے دل میں جگہ بنانے کا فن بھی آتا تھا۔ یہ ان کی محبت کا ہی اثر تھا کہ لیاقت نیازی ان کی وفات کے بعد اس اجڑے ہوئے خانوادے کے لیے ذات کبریا کے بعد سائبان ثابت ہوئے۔

نسیم ایہ کی انسان دوستی کا ہی یہ اعجاز ہے کہ ان کی بیوی بتاتی ہے کہ لوگوں نے ان کے نام کے عمرے ادا کیے، ان کی کتاب ''برگِ لرزاں'' کی تقریب رونمائی مختلف شہروں میں منعقد کرائی گئیں۔ ڈاکٹر انور سدید ان کی کتاب برگِ لرزاں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''نسیم نے شاعری سے محبوبہ کی طرح پیار نہیں کیا کہ وہ نظارۂ رخ و گیسو میں کھو جاتے اور جوں ہی بدن کی دھوپ ڈھلے گزری بہاروں کو یادوں کی بارات بنا ڈالے۔ نسیم نے شاعری سے فعال مردوں جیسا سلوک کیا اور اسے تیز دھار تلوار کی طرح استعمال کیا۔ چنانچہ اس کی شاعری سے جو شخصیت مرتب ہوتی ہے وہ ایک ایسے مردِ صحرائی کی شخصیت ہے جو اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرتا ہے اور کرگس کے جہاں میں اپنا جہان رنگ بناتا ہے۔''(۳۰)

عصر حاضر میں نسیم ایہ ان بڑے شاعروں میں شامل کیے جاتے ہیں جن کے الفاظ کا طنطنہ، معنی کا پھیلاؤ، مضامین کی ندرت، مفاہیم کی عظمت، اصطلاحات کا چناؤ اور شاعرانہ رکھ رکھاؤ طلسم و

زبان و بیان کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کی شاعری اگرچہ مخصوص مکتبہ فکر کی ترجمان نہیں اور غالباً وہ بھی اس کے مدعی نہیں ہیں۔ ان کی آواز ہر مکتبہ میں سنی جا سکتی ہے۔ ان کا درد علاقائی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ ان کے نظریات باوصفِ اختلافِ حیاتِ انسانی کے مثبت زاویے کہے جا سکتے ہیں۔ (۳۱)

مندرجہ بالا اقتباس ڈاکٹر خیال امروہوی کی کتاب ''محاکے'' کا ایک حصہ ہے اور جہانِ دیگر میں احسان دانش نسیم ایہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''نہایت ذکی انسان ہیں، نثر اور نظم میں یکساں ہیں لیکن ان کی نظم نثر سے زیادہ اثر رکھتی ہیں اور مشاعروں میں ترنم سے وہ اس میں اور بھی جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''پیراہن'' کے نام سے چھپی ہے جو ان کے محاسن کا آئینہ ہے۔ ابھی ان کا مجموعہ کلام نظر سے نہیں گزرا۔ (۳۲)

عطاء الحق قاسمی روزنامہ نوائے وقت کے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ''نسیم ایہ شاعری ہی نہیں کرتے، شاعروں کی تربیت بھی کرتے ہیں اور یوں ان کی ایک حیثیت استاد شاعر کی بھی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اب تک بیسیوں نوجوانوں کی شعری تربیت کی ہے جن میں جعفر بلوچ جیسے شاعر بھی شامل ہیں جو اب خود استاد شاعر ہیں۔ گویا نسیم ایہ اب ماشاء اللہ استاذ الاساتذہ کے منصب پر فائز ہیں۔'' (۳۳)

معروف شاعر اور محقق جاوید احسن نے راقم کو نسیم ایہ کے حوالے سے بتاتے ہوئے کہا:

> ''نسیم ایہ ریگ زارِ تھل کا عظیم شاعر اور شعلہ نوا مغنی ہے جس نے تھل کے ٹیلوں میں شاعری کی جوت جگائی اور اپنے شہر میں ترنم سے اس کی خموش فضاؤں کو نغمہ زار بنا دیا۔ نسیم ایہ مثنوی اور غزل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر اردو کے شاعر تھے مگر اپنی مادری زبان سرائیکی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ خوبصورت شاعری کرنے والے پر بہار شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ملک کے ادبی حلقوں میں نہ صرف اپنی پہچان کرائی بلکہ اپنے ساتھ ایہ کو بھی شہرت بخشی۔

ان کی غزلیہ شاعری سے چند پر تاثیر و آبدار نشتر ملاحظہ کیجئے:

گم سم تھی دو جہاں کی حقیقت مرے بغیر　　میں آ گیا تو لوح و قلم بولنے لگے

دیارِ مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو　　ستم ظریف پیمبر خرید لیتی ہے (۳۴)

پروفیسر مہر اختر وہاب ان کے بارے میں کہتے ہیں:

''شخصی اعتبار سے ایہ کی ایک تہذیبی شخصیت تھے، تہذیبی حوالوں کی ایک خوبصورت تفسیر تھے، محبت کرنے والے انسان تھے۔ اگر چہ مسلم لیگ کے جلسوں میں باقاعدہ جاتے تھے لیکن ہندوؤں سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد چلے جانے والے ہندو دوستوں کو یاد کر کے روتے تھے۔ بناوٹ اور تصنع سے بالکل پاک تھے، سادگی و بے تکلفی ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ مزاجاً روایت پرست تھے، شاعری میں دھیمے لہجے کے شاعروں کو پسند نہ کرتے تے۔ میر اور ناصر کی شاعری سے زیادہ شغف نہ رکھتے تھے، جاندار اسلوب کو پسند کرتے تھے۔ جوش کی تقلید کی نسبت سے تھل کے شاعر شباب کہلاتے تھے۔ منطقی اور عقلی رائے دینے کی بجائے زندگی کا جذباتی حوالے سے مطالعہ کرتے تھے۔''(۳۵)

ڈاکٹر لیاقت علی نیازی جو نسیم ایہ کے داماد ہیں اور بہت عزیز دوست بھی ان کے متعلق اپنے غیر مطبوعہ مضمون جو انھوں نے دامنِ یوسف پر لکھا' میں یوں رقمطراز ہیں:

''حضرت نسیم ایہ کی شاعری ناسوتی نہیں لاہوتی ہے۔ وہ آزاد فضا کے شاعر تھے جن کی شاعری میں بے باکی اور رجائیت ہے۔ وہ ہر زر پرست کی نخوت پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔

یہ دعا مانگو کہ ساری عمر میری مفلسی　　انتقامِ نخوتِ دارا و جم لیتی رہے

اردو ادب میں یوسف و زلیخا کے قصے پر بے شمار شعرا نے قلم اٹھایا ہے۔ نسیم ایہ نے جس انداز میں احسن القصص کو منظوم کیا وہ انداز ہی نرالا ہے۔''(۳۶)

نسیم ایہ کے ساتھ منائی جانے والی شام کا حوالہ حکیم عبدالمجید راجی نے ایک رسالے کی صورت میں جمع کیا ہے۔ اس میں شامل ایک مضمون ''انسان کی تلاش میں'' پروفیسر اثر ترمذی نے تحریر کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''نسیم کی شاعری میں انسان کی تلاش کا جمالیاتی احساس وخیال ذہن کی زرخیز وادیوں سے گزرتا ہوامرکب جذبات سے پیاس بجھاتا ہوافنی شکل متعین کرتا ہے تو اس کے ہاں داخلیت اورخارجیت کاحسین توازن جنم لیتا ہے۔ جب وہ اپنے اردگرد پرنظر ڈالتا ہے اوراسے وہ انسان نظرنہیں آتا جس کے لیے اس کی روح روزِازل سے پریشان ہےتو کہہ اٹھتا ہے:

ابھی یزید پرستی کی رسم جاری ہے ملوکیت کا جنازہ ابھی کہاں نکلا(۳۷)

انجم ملک ایم اے لکھتے ہیں:

''شعرفن کار کی شخصیت اوراس کے ذہن کی خوشبو ہے۔نسیم صاحب کی دامنِ یوسف کی پیشانی پرایک شعرنقش ہے۔''

نسیم دستِ زلیخا کی شرم ساری پر ہنوزدامنِ یوسف کےتا رہنتے ہیں(۳۸)

شاعرشباب اوربلبل تھل کا خطاب حاصل کرنے والےنسیم ایّہ کوتاجدارالشعرا کالقب دیا گیا۔ یہ لحنِ داؤدی رکھنے والافن کار ۱۹۸۸ء میں ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ ایّہ سے کروڑلعل عیسن ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جارہے تھے، ویگن کو حادثہ پیش آ گیا۔ یہ نومبر کامہینہ تھا، اس حادثے میں ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی، پیشانی پر چوٹ آئی،نشترہسپتال میں ۱۵یوم تک زیرعلاج رہے۔ابھی ٹانگ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی کہ گردے کی تکلیف شروع ہوگئی۔بقول ان کی اہلیہ گردے پر بھی چوٹ آئی تھی،شاید اسی لیے وہ چوٹ بعد میں کینسر بن گئی۔

بیماری کے دوران بھی انھوں نے اپنی انا اورخودداری کا بھرم قائم رکھا۔ بیماری کے ایام میں انھیں اکادمی ادبیات کی طرف سے وظیفہ ملنے لگا۔حادثے کے بعد وہ ملازمت پر دوبارہ نہ جاسکے۔گوکہ انھیں کینسر کی تشخیص کے بارے میں نہ بتایا گیا لیکن وہ پھر بھی جانتے تھے کہ اب وہ صحت یاب نہ ہوسکیں گے۔اسی لیے انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سفرآخرت اورموت کےمتعلق ایسے اشعار کہے جواس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ حساس شاعر کے وجدان نے اسے پہلے ہی مطلع کردیا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔اشعارملاحظہ کیجیے:

روگھنو تاریخ شودی آخری دماں تے ہے　　ہن دعا دا وقت ہے ملھا دوا دائیں ریہا

بقول سلیم اختر ندیم یہ ان کا آخری شعر تھا

سفرِ آخرت کے متعلق لکھتے ہیں:

کیا تھیا جنڈے کے جو لمبے سفر ویندا پیاں　　اوپرا گھر چھوڑ کے اج اپنے گھر ویندا پیاں

زندگی تے موت دا کوئی روگھ لگ سگیا نھی　　بے خبر آیا ہیں تے بے خبر ویندا پیاں (۳۹)

اپنی زندگی میں سفید پوشی کا جو بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ اہلِ خانہ کے لیے اس کو قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔ یوں ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۰ کو نسیم ایہ اس بیماری کے سبب انتقال فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد زندگی نے ان کے اہلِ خانہ کے لیے عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یوں اخبارات کی یک کالمی سرخی بننے کے بعد ایک فن کار جو اپنے علاقے کی پہچان تھا، نہ رہا۔ روزنامہ امروز نے ان کی وفات کی خبر یوں شائع کی:

''معروف شاعر نسیم ایہ طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ نمازِ جنازہ میں ادبی، سماجی اور سیاسی مکتبہ فکر کے سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ مرحوم کو ان کے آبائی قبرستان شیخ جلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ قل خوانی ۲۸ اکتوبر بروز اتوار بوقت ۸ بجے صبح جامع مسجد شمالی میں ادا کی جائے گی۔'' (۴۰)

ایہ کی ادبی زندگی کا سہاگ اجڑ گیا جس کے دم سے ادبی محافل برپا ہوا کرتی تھیں، گھر والوں کو بے آسرا، دوستوں کو اداس اور اپنے پیارے شہر ایہ کو ویران کر گیا۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) مہر اختر وہاب، پروفیسر سے ایک ملاقات، لیہ ۲۰/ اکتوبر ۲۰۰۷ء

(۲) برکت اعوان، یادوں کے گلاب، روزنامہ نوائے وقت ملتان، قسط نمبر ۱، ۲۲ ستمبر ۱۹۹۸، ص-ن

(۳) جعفر بلوچ، پروفیسر، نسیم ایہ ایک عظیم شاعر روزنامہ خبریں، ۳۱ اگست ۲۰۰۷ء

(۴) رانا اعجاز احمد سے ملاقات ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۸

(۵)برکت اعوان، یادوں کے گلاب، روزنامہ نوائے وقت ملتان ۲۲ ستمبر ۱۹۹۸

(۶)ایضاً

(۷)نسیم لیہ، برگِ لرزاں، ناشر بزم اقبال مظفر گڑھ ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۶

(۸) راقم کی زیتون اختر سے گفتگو

(۹) راقم کی سلیم اختر ندیم سے گفتگو، بمقام لیہ بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۷

(۱۰)از بیاض نسیم لیہ غیر مطبوعہ

(۱۱)راقم کی ملاقات زیتون اختر زوجہ نسیم لیہ، ریلوے ریسٹ ہاؤس لیہ بوقت ۱۲ بجے دن، ۲۱/اگست ۲۰۰۷ء

(۱۲)جعفر بلوچ، پروفیسر نسیم لیہ.....ایک عظیم شاعر روزنامہ خبریں ملتان ۳۱ اگست ۲۰۰۷ء

(۱۳)برکت اعوان سے راقم کی ایک ملاقات، اعوان ہاؤس لیہ رہائش برکت اعوان بتاریخ ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء

بوقت ۷ بجے شام

(۱۴)از بیاضِ نسیم لیہ غیر مطبوعہ (۱۵)جعفر بلوچ، پروفیسر نسیم لیہ.....ایک عظیم شاعر

(۱۶)ڈاکٹر تحسین فراقی سے راقم کا رابطہ بذریعہ ٹیلی فون، ۱۵ ستمبر ۲۰۰۷ء، بروز ہفتہ ۸ بجے شب

(۱۷)از بیاضِ نسیم لیہ غیر مطبوعہ (۱۸)راقم سے گفتگو ۱۵ ستمبر ۲۰۰۷ء

(۱۹)راقم کا پروفیسر مہر اختر وہاب سے انٹرویو

(۲۰)نسیم لیہ، مڈویک ایڈیشن روزنامہ نوائے وقت، ۱۴ اپریل ۱۹۸۹ء، ص-ن

(۲۱)خیال امروہوی سے راقم کی ملاقات ڈاکٹر خیال امروہوی کی رہائش گاہ بمقام لیہ، ۲۱/اگست ۲۰۰۷ء

(۲۲)زیتون اختر زوجہ نسیم لیہ سے راقم کی ملاقات کینال ریسٹ ہاؤس، ۲۱ اگست ۲۰۰۷

(۲۳)یادوں کے گلاب، برکت اعوان (۲۴)نسیم لیہ، دیباچہ برگِ لرزاں، ص ۱۰-۱۱

(۲۵)راقم کی ملاقات زیتون اختر سے

(۲۶)بحوالہ جعفر بلوچ، آیاتِ ادب (تذکرہ شعرائے لیہ و مظفر گڑھ) مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۹۸)

(۲۷) خیال امروہوی، ڈاکٹر، محاکے، کلاسیک ادب لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۴

(۲۸)مزمل حسین، ڈاکٹر، نسیم لیہ غیر مطبوعہ مضمون

(۲۹) ازبیاضِ نسیم لیہ، غیر مطبوعہ، مملوکہ زیتون اختر زوجہ نسیم لیہ

(۳۰) نسیم لیہ برگِ لرزاں، ص ۱۳-۱۴

(۳۱) خیال امروہوی، ڈاکٹر، محاکمے، کلاسیک ادب لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۳

(۳۲) احسانِ دانش، جہان دیگر حصہ دوم، خزینہ علم و ادب، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۱ء ص ۳۵

(۳۳) عطاء الحق قاسمی، کالم (وزن دیوار سے) روزنامہ نوائے وقت، ۲۷ مارچ ۱۹۹۶ء

(۳۴) تاثرات جاوید احسن غیر مطبوعہ

(۳۵) مہر اختر وہاب، پروفیسر سے ایک انٹرویو، بمقام لیہ، ۲۸ نومبر ۲۰۰۷ء

(۳۶) لیاقت علی نیازی، ڈاکٹر، دامنِ یوسف غیر مطبوعہ

(۳۷) عبدالمجید راحی، حکیم، سید، نسیم لیہ کے ساتھ ایک یادگار شام، ڈسٹرکٹ پریس کلب، جاوید پرنٹنگ
پریس مظفر گڑھ، ص ۹

(۳۸) مضمون، انجم ملک۔ ایم۔ اے۔ ایضاً، ص ۱۱

(۳۹) راقم کی سلیم اختر ندیم سے گفتگو بمقام لیہ، بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۷ء

(۴۰) روزنامہ امروز ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۰ء

۞۞۞